R. No. 21865 Regd. No. 922

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ٹیلی فون - ۲۹
قیمت تین روپے سالانہ
فی پرچہ دس نئے پیسے

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۲۲ - شمارہ ۳۴	ایڈیٹر - آل احمد سرور	۸ ستمبر ۱۹۶۳ء

اداریہ

اپنا اپنا فرض ادا کیجئے

نان پارہ، ہلدوانی، محمود آباد سے خبر ملی ہے کہ وہاں چھٹے درجے میں اُردو کی تعلیم کا انتظام ہو گیا۔ ہم ان اسکولوں کے ذمے دار حضرات کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے عوام کے جذبات کا لحاظ رکھا۔ ان جگہوں کے اُردو دوست بھی لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے سرپرستوں کے ذریعے سے مدرسے کے ذمے دار حضرات کو توجہ دلائی۔ اخباروں میں مضامین لکھنا اور حکومت یا اکثریت کی زیادتی کا رونا رو کر خاموش ہو جانا آسان ہے، لوگوں کو توجہ دلانا، افسروں سے ملنا، کوشش کرنا، مقامی حضرات کی ہمدردی حاصل کرنا جدوجہد چاہتا ہے اس لئے مشکل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ جدوجہد جاری رہے گی اور ہر جگہ اُردو والوں کی قابل لحاظ اور معقول تعداد کو دیکھتے ہوئے اُردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائیگا۔

قابل لحاظ تعداد کی بات ذرا مبہم ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا مشورہ ہے کہ اُردو دوست کم سے کم پانچ طلبہ کی درخواستیں آنے پر مناسب انتظام کا مطالبہ کریں۔ عام طور پر ثانوی اسکولوں میں کسی مضمون کی تعلیم کا انتظام کرنے کے لئے پانچ کی قید ہے۔ یہی قید تیسری زبان کے سلسلے میں بھی رکھی جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قابل لحاظ، جیسے مبہم لفظ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کچھ ہیڈ ماسٹر صاحبان اُردو کی تعلیم کا انتظام کرنے میں پس و پیش کریں۔ ہمارے خیال میں ڈائرکٹر کو اس سلسلے میں قدم اُٹھانا چاہیے۔

ڈائرکٹر نے جو احکام اس سلسلے میں صادر کئے ہیں اُن کا مجموعی تاثر یہ ہوتا ہے کہ ہر ہندوستانی زبان کی تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے بشرطیکہ اسٹاف اور مالیات اجازت دیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ اُردو اور سنسکرت کے لئے فوراً انتظام کیا جائے کیونکہ زیادہ تعداد انھیں دونوں زبانوں کے طلبہ کی ہوگی۔ اس کے علاوہ اگر جنوبی ہند کی کسی زبان کو کچھ لوگ سیکھنا چاہیں تو پانچ کی قید کے ساتھ اس کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔

اتر پردیش کی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر سرکاری اسکول میں خود ہی اُردو کی تعلیم کا انتظام کرے۔ اس کی وجہ سے پرائیویٹ اسکولوں کے ذمے دار حضرات کو انتظام کرنے میں لیت و لعل کا موقع نہ ملے گا۔ اُردو دوست ہر جگہ کوشش کریں اور حکومت جو کچھ ہے وہ کرے تو تیسری زبان کے طور پر اُردو کی تعلیم کا اُتر پردیش میں خاصے بڑے پیمانے پر انتظام ہو سکتا ہے۔ دیکھنا ہے کون کیا کرتا ہے؟

اس اشاعت میں

سیر بین

آج کل یونی ورسٹی میں شب زندہ داروں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ چوریوں کی کثرت نے لوگوں کو اتنا بدحواس کر دیا ہے کہ اب وہ دیر تک جاگتے ہیں۔ رات میں لوگ اُٹھ کر دیکھتے ہیں کہ پڑوس میں بتی جل رہی ہے یا اندھیرا ہو گیا۔ چوروں نے بھی اپنی سرگرمیاں اب ہوسٹلوں تک پہنچا دی ہیں۔ یوں تو کبھی کبھار پولیس بھی گشت کرتی ہے اور پراکٹر کے آدمی بھی پھرتے رہتے ہیں، مگر چور بھلا انھیں کیوں خاطر میں لانے لگے۔ چنانچہ اب لوگوں کو یہ فکر نہیں رہی کہ اتر پردیش کا بڑا وزیر کون ہوتا ہے، یا مرکزی کابینہ میں نیا آدمی کون لیا جا رہا ہے۔ اُنھیں یہ معلوم کرنے کی خواہش رہتی ہے کہ اب کے چوروں کی واردات کہاں ہوئی۔

ہمارے وزیر اعظم بھی خاصے ستم ظریف ہیں۔ شری کامراج کے کندھے پر رکھ کر خوب بندوق چھوڑی اور بڑے بڑے سورما شکار ہو گئے آدھی درجن مرکزی وزیر گئے اور آدھی درجن بڑے وزیر۔ اب یہ لوگ پارٹی کا کام کریں گے، نگران کا کام تو تمام ہو گیا۔ لطف یہ ہے کہ ابھی ہمارے وزیر اعظم کو تسلی نہیں ہوئی۔ ایک فہرست اور تیار ہو رہی ہے جس کے مطابق وزارتوں کی گدی سے کچھ لوگوں کو اتار کر تنظیمی کاموں کے لئے اُنھیں نامزد کیا جائے گا۔ کچھ بیرونی حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس تبدیلی سے حکومت کی کارکردگی پر ضرور اثر پڑے گا، مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ ہماری سول سروس کے ہوتے وزیروں کی تبدیلی کی چنداں اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ موجودہ وزیر تو خواہ مخواہ دخل دینے لگے تھے، اب سب باتیں قاعدے سے ہوں گی اور دفتر مقررہ دستور کے مطابق حکومت کی مشینری کو چلاتا رہے گا۔

ہندی دوستی کا ایک عجیب و غریب مظاہرہ حال میں ہوا۔ ایک صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے۔ اُن کے ساتھیوں نے انگریزی میں بات چیت شروع کر دی۔ انھوں نے اعتراض کیا کہ بھائی بدیشی بھاشا کیوں بولتے ہو، ہندی میں بات کیوں نہیں کرتے۔ ان لوگوں نے بگڑ کر کہا کہ آپ سے مطلب۔ ہم لوگ آپس میں بات کر رہے ہیں۔ آپ کیوں دخل دیتے ہیں۔ مگر یہ ہندی کا اپمان کیسے گوارا کر لیتے جب انھوں نے دیکھا کہ یہ لوگ کسی طرح نہیں سُنتے تو ایک دم زنجیر کھینچ لی۔ گاڑی رک گئی، گارڈ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ کس نے زنجیر کھینچی ہے اور کیوں؟ واقعات معلوم ہونے پر ان ہندی کے پریمی کو حراست میں لے لیا گیا۔ گاڑی انھیں چھوڑ کر آگے چل دی۔ وہ گارڈ یقیناً کوئی ہندی کا دروہی تھا۔ اُسے انگریزی بولنے والوں کو گرفتار کرنا چاہیے تھا۔

نظر حیدر آبادی کا انتقال

جناب تحسین سروری کے خط سے معلوم ہوا کہ نظر حیدر آبادی کا چوالیس سال کی عمر میں اچانک انتقال ہو گیا۔ مرحوم حضرت علی اختر حیدر آبادی کے فرزند رشید تھے اور خود بھی ایک اچھے شاعر تھے حال ہی میں انھوں نے ہماری زبان کے لئے جوش اور حیدر آباد کے سلسلے کے لئے ایک مضمون بھیجا تھا جو دو اشاعتوں میں شایع ہوا تھا۔ تحسین سروری لکھتے ہیں کہ مرحوم اپنا یہ مضمون مطبوعہ صورت میں دیکھ بھی نہیں پائے۔ اس جواں مرگ شاعر کی موت پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

ہلدوانی میں سہ لسانی فارمولا پر عمل

ہلدوانی بذریعہ ڈاک حکومت یوپی کی منظور کردہ تجویز اور ڈائرکٹر آف ایجوکیشن اُتر پردیش کے جی او آنے پر جمعیۃ علماء و انجمن ترقی اُردو ہلدوانی کی میٹنگ ہوئی جس میں پاس ہوا کہ تمام اسکولوں کو تحریر کیا جائے اور ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپلوں سے ملا جائے کہ حکومت یوپی کے سرکلر کے مطابق اسکولوں میں اُردو تعلیم کا انتظام بھی ہو، لہٰذا مولانا کلیم اللہ صاحب صدر ضلع جمعیۃ علماء و رکن انجمن ترقی اُردو اسکولوں میں جا کر ملے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہلدوانی کے ایم بی انٹر کالج اور مہاتما گاندھی ہائر سکنڈری اسکول میں اُردو پڑھنے والے بچوں کو فارم دئے گئے۔ تقریباً چالیس بچے مہاتما گاندھی اسکول میں اور اتنے ہی ایم بی انٹر کالج میں داخل ہو چکے ہیں اور دونوں اسکولوں میں اُردو ٹیچر مقرر کر دئے گئے اور باقاعدہ اُردو تعلیم جاری ہو گئی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان دونوں اسکولوں میں پہلے سے ہی آٹھویں کلاس تک اُردو تعلیم کا انتظام ہے۔ نیز میونسپل بورڈ کے کئی پرائمری اسکولوں میں اُردو تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہے اور کئی اسکولوں میں اُردو کے میونسپل بورڈ سے امداد بھی ملتی ہے اور جن اسکولوں میں اب تک اُردو کا انتظام نہیں ہے وہاں جمعیۃ علماء اور انجمن ترقی اُردو ہلدوانی تا اجرائے تعلیم اُردو اپنی جد و جہد جاری رکھے گی۔ نیز ان اسکولوں میں سنسکرت پہلے سے ہی تھی اور اب بھی ہے۔ (شوکت علی آسیر سکریٹری انجمن)

گوردیال سنگھ بھولا - ایڈووکیٹ دہلی

محمد ظفر بہادر شاہ اور کوہ نور ہیرا

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کی جانب سے ماہانہ رسالہ "سب رس" گزشتہ پچیس سال سے شائع ہوتا ہے اور بفضل خدا ابھی تک جاری ہے۔ اس رسالے کا جنوری فروری ۱۹۶۳ء نمبر جس میں محمد ظفر بادشاہ دہلی کی زندگی اور ان کی شاعری کے بارے میں بڑے پایہ کے مضامین شائع ہوئے ہیں میری نظر سے گزرا۔ ان میں ایک مضمون جناب ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب کا ہے جس کا عنوان ہے "بہادر شاہ ظفر" جس کی آخری چند سطور یہ ہیں: "بادشاہ اور رعایا کا یہ اضطراب بالآخر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں پھوٹ پڑا مگر تقدیر نے یاوری نہ کی۔ تاج برطانیہ کی قسمت میں "کوہ نور" کو چمکنا تھا چمک کر رہا" (آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے شکریہ کے ساتھ) اس کے بعد ایک دیگر مضمون زیر عنوان "بجھتو رہا چراغ" کے ہے یہ جناب حکیم یوسف حسین خاں صاحب کے قلم سے ہے۔ اس مضمون کی آخری سطور یہ ہیں: "اگر وہ (یعنی انگریز) یہ خاندانی نسخہ علی الاعلان بیان کر دیتا تو آنے والے ۹۰ سال اور ان میں جو کچھ زر و جواہر بٹورا۔ اس کا ان سے برطانوی خزانہ کیسے مالا مال ہوتا۔ تخت طاؤس برٹش میوزیم میں کیسے پہنچتا۔ کوہ نور تاج برطانیہ پر (میں) کیسے جگمگاتا؟ کیسے۔ جی ہاں کیسے؟"

بظاہر یہ دونوں مضامین بڑے مدلل اور زوردار ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوہ نور ہیرے یا تخت طاؤس کا بیچارے محمد ظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی سے کیا تعلق ہے۔ اس کی قدیم تاریخ سے قطع نظر کوہ نور ہیرا ظہیر الدین بابر کے پسر ہمایوں کو شہنشاہ ابراہیم لودھی کی بیوہ ماں نے پیش کیا تھا۔ بادشاہ ہمایوں تیرہ سال ایران میں جلا وطن رہا۔ لیکن یہ ہیرا اس نے سنبھال کر رکھا۔ جب ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو یہ ہیرا کوہ نور محمد شاہ رنگیلے کی کلغی کی زیب و زینت تھا۔ نادر شاہ نے چال بازی سے محمد شاہ کے ساتھ پگڑی تبدیل کر لی۔ اس کے چند ماہ بعد جب نادر شاہ ملک ہندوستان سے واپس پھرا تو وہ لال قلعہ دہلی سے شہنشاہ شاہ جہاں کا تخت طاؤس بھی اٹھوا کر ایران لے گیا۔ ۱۹۰۹ء میں جب محمد علی قاچار شہنشاہ ایران کے خلاف بغاوت برپا تھی تو لندن کے اخبار "ٹائمز" نے ایک شخص مسٹر ڈیوڈ فریزر کو اپنا نامہ نگار خصوصی مقرر کر کے ایران بھیجا۔ اس شخص نے ۱۹۱۰ء میں ایک کتاب بزبان انگریزی شائع کی جس کا نام ہے "ٹرکی اینڈ پرشیا ان ریولٹ" (ٹرکی اور ایران کا انقلاب)۔ اس کتاب میں تخت طاؤس کا بغیر اس کے ہیروں اور سونے چاندی کے پتروں کے شہر طہران کے ایک شاہی عجائب خانے میں پڑا ہوا بیان کیا گیا ہے۔ اور مصنف مذکور نے ساتھ ہی تخت طاؤس کا فوٹو بھی چھاپ دیا ہے۔

۱۷۴۷ء میں ایک سیاسی سازش کے ساتھ نادر شاہ کو اس کے فوجی افسران نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد نادر شاہ کے ایک قاچار جرنیل نے ایران کے علاقے میں اپنا تسلط جما لیا اور اس کے ایک افغان جرنیل احمد شاہ ابدالی نے کابل و قندھار میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ چنانچہ کوہ نور ہیرا احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ پڑ گیا۔ اس کے خاندان سے آخری بادشاہ شاہ شجاع شہر کابل میں تھا جس کو اس کے وزیر دوست محمد نے نکال باہر کیا اور وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پناہ میں چلا گیا۔ اور لاہور میں موری دروازے کے اندر ایک وسیع حویلی میں اس کی رہائش کا انتظام کر دیا گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع سے ۱۸۳۵ء میں ہیرا کوہ نور حاصل کر لیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی یہ نجی جائداد تھی اور ۱۸۳۹ء میں وہ اس ہیرے کو جگن ناتھ کے مندر دیوتا کی مالی کے لئے بھجوانا چاہتا تھا لیکن اس کے صلاح کاروں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ انگریزوں اور سکھوں کی دوسری لڑائی کے اختتام پر ۱۸۴۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور نابالغ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے ساتھ عہد نامہ مرتب ہوا تو اس میں ایک شرط یہ بھی رکھی گئی کہ کوہ نور ہیرا کمپنی بہادر کے حوالے کیا جائے گا۔ چنانچہ یہ ہیرا کمپنی بہادر نے حاصل کر کے انگلینڈ بھیج دیا۔ ۱۸۵۴ء میں مہاراجہ دلیپ سنگھ نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور وہ لارڈ لوگن کے ہمراہ انگلینڈ روانہ ہو گیا۔ ملکہ وکٹوریا جیسی بہا ہیرا اپنے لئے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو قانوناً مہاراجہ دلیپ سنگھ کی نجی ملکیت کو غصب کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا اس لئے کمپنی بہادر نے یہ ہیرا مہاراجہ دلیپ سنگھ کی جانب سے ملکہ برطانیہ کو بطور تحفہ پیش کر دیا۔ لیڈی لوگن اپنی کتاب موسومہ "سر والٹر لوگن اینڈ دلیپ سنگھ" میں بیان کرتی ہے کہ "میں اس وقت ملکہ وکٹوریا کی خدمت میں حاضر تھی اور مہاراجہ دلیپ سنگھ بھی موجود تھے۔ ہیرا کوہ نور میری جیب میں تھا۔ میں نے نکال کر مہاراجہ دلیپ سنگھ کے ہاتھ میں دے دیا۔ دریائے ٹیمز کی جانب جو کھڑکی بکنگھم پیلس کی کھلتی ہے مہاراجہ اس کھڑکی میں کھڑا ہو کر چند لمحے اس لاثانی ہیرے کو بغور تکتا رہا۔ میرا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا کہ کہیں وہ اس ہیرے کو دریائے ٹیمز میں ہی نہ پھینک دے۔ لیکن اس نے کھڑکی سے کمرے میں واپس آ کر کوہ نور ملکہ وکٹوریا کے دست مبارک میں دے دیا۔" اس کے کچھ عرصہ بعد اس ہیرے کے سات گول ٹکڑے کاٹ کر برطانیہ کے شاہی تاج میں لگا دئے گئے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ بیچارے محمد ظفر بہادر شاہ نے نہ تو کبھی ہیرا کوہ نور دیکھا تھا اور نہ ہی تخت طاؤس ہیر جہان

ہوئے تھے کیونکہ ہندوستان کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے چند سال پہلے ہی کوہ نور کی ملکیت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ دیگر تخت طاؤس تو ایک سو بیس سال پہلے ہی ملک ایران میں پہنچ چکا تھا۔ پس محض جذبات کے تحت ایسی باتیں بیان نہ ہونی چاہئیں جو تاریخی طور پر صحیح نہ ہوں۔

دوسری بات یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ دہلی میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے چند سال پیشتر ہی سیاسی بے چینی موجود تھی۔ بادشاہ دہلی کو جو نذر ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے گزرانی جاتی تھی وہ بند کی جا چکی تھی۔ بادشاہ دہلی انگریز ریزیڈنٹ متعینہ دہلی کو رسمی خط و کتابت میں "فرزند ارجمند" لکھا کرتا تھا۔ اس کی بھی ممانعت کر دی گئی تھی۔ تقرری ولیعہدی کا سلسلہ اور خطاب شہنشاہ ہند ختم کر دیا گیا تھا۔ ؎

اے ظفر اب ہے تجھی تک اہتمام سلطنت
بعد تیرے نہ ولیعہدی نہ نام سلطنت

اس بُرے وقت میں دہلی کے ایک متمول ہندو رام جی داس گڑوالے نے شہنشاہ بہادر شاہ کو ترغیب دی کہ انگریزوں کے خلاف جنگ کرنی چاہیے۔ یہ شخص اس خاندان سے تھا جو دہلی میں "گڑوالے" کہلاتے ہیں۔ یہ گوئل گوت کے اگروال بنیے ہیں۔ بادشاہ سلامت نے سیٹھ رام جی داس گڑوالے کو جواب دیا کہ بغیر فوج کے لڑائی نہیں لڑی جا سکتی اور فوج رکھنے کے واسطے روپیہ درکار ہے۔ لال قلعہ دہلی میں توپیں تو بہت ہیں لیکن گولہ بارود نہیں۔ اس پر سیٹھ رام جی داس نے بغیر کسی تحریر یا معاہدے کے کئی لاکھ روپے کی امداد دی اور اس کے بعد دو بار کثیر مالی امداد بہم پہنچائی لیکن چٹورے شاہی اہلکار تمام روپیہ چٹ کر گئے۔ سیٹھ رام جی داس کو انگریزوں نے ۱۸۵۸ء میں پھانسی دے دی۔ شہنشاہ بہادر شاہ کے قریبی رشتہ دار اور معتمد اہلکار انگریزوں کے جاسوس بنے ہوئے تھے اور انہوں نے اس امداد کی رتی رتی مخبری انگریزوں سے کر دی تھی۔ لہٰذا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ شہنشاہ بہادر شاہ کو بغیر اس کی مرضی کے کمپنی کے باغی افسروں اور تلنگوں نے اپنا آلۂ کار بنا لیا تھا۔ بہادر شاہ بادشاہ نے اگر جنگی معاملات کے سرانجام دینے میں کوتاہی یا سستی کی تو صرف اس وجہ سے تھا کہ اس کے معتمد اہلکار اس کے جنگی پلان میں بجائے مدد دینے کے اُلٹے اپنے انگریز سرپرستوں کے ایما پر روڑے اٹکاتے رہتے تھے چنانچہ ظفر کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

دوست کہنے کے یہاں اپنا   کون اپنا ہے اور کہاں اپنا

دیگر: "یہ زمانہ بھی ہے بُرا ظفر چلو بچ کے سب سے الگ تھلگ
نہ فیض کوئی کسی کا یاں نہ کسی کا کوئی بھی یار ہے"

بادشاہ بہادر شاہ ظفر مذہبی رواداری کی ایک زندہ مثال تھا۔

۱۸۵۷ء کے دوران میں بادشاہ نے یہ قانون نافذ فرمایا کہ دہلی کے خاکروب کوڑا کرکٹ لاد کر لے جانے کے لیے بیلوں کا استعمال نہ کیا کریں بلکہ گدھوں پر کوڑا لادا کریں۔ کیونکہ گائے ہندوؤں کے نزدیک متبرک جانور ہے اور بیل کی اس سے "قرابت داری" ہے۔ اس پر کالی مسجد والے مولوی صاحبان نے بادشاہ کے خلاف فتویٰ صادر فرمایا۔ ہندو تلنگے سپاہی جب شہر دہلی میں نعرے لگاتے ہوئے گزرتے تھے تو ان کی زبان پر یہ نعرہ عام ہوتا تھا۔

بہادر شاہ بادشاہ کی جے ۔ دین دنیا کے گُسیاں کی جے

یعنی وہ بادشاہ دہلی کو اپنا دینی پیشوا بھی تسلیم کرتے تھے۔

یہ کس کے شعر ہیں

"ہماری زبان" ایک مدت سے زیر مطالعہ ہے۔ اس کے علمی و ادبی مضامین، پُرمغز اداریہ، معیاری نظمیں و غزلیں اور معلوماتی مراسلے خاصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے ہر ہفتے شدت سے انتظار رہتا ہے۔

ایک شعر مدت سے میرے ذہن میں محفوظ ہے لیکن باوجود انتہائی کوشش کے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس کا ہے شعر یہ ہے ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

ایک زمانے میں ہفت روزہ "لاہور" لاہور میں مولوی محمد عبداللہ قریشی صاحب (ایڈیٹر "نقوش" لاہور) "لطائف ادب" کے عنوان سے ایک ہفتہ وار کالم لکھا کرتے تھے۔ اُس میں ایک انھوں نے اس شعر کا بھی ذکر کیا تھا جس سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یہ کسی لکھنوی زنار بند شاعر کی غزل کا مطلع ہے جس کا سارا کلام زمانے نے تلف کر دیا۔

اگر "ہماری زبان" کے کسی قاری کو اس لکھنوی شاعر کا نام معلوم ہو جس کا یہ عارفانہ مطلع زندہ رہ گیا ہے تو وہ "ہماری زبان" کے ذریعے یا براہ راست مجھے اطلاع دیں۔ میں ذاتی طور پر ان کا ممنون ہوں گا۔

اسی طرح ایک اور شعر ہے ؎

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

اس شعر کے خالق کے بارے میں بھی اگر کسی صاحب کو علم ہو تو ازراہِ کرم مطلع فرمائیں۔ (ناصر زیدی۔ مدیر معاون ماہنامہ "ادبِ لطیف" لاہور)

ضروری اعلان

براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے۔

رابندر ناتھ ٹیگور

(مترجم: اقبال کرشن)

معصوم افکار

۱۔ چاچا کہتے ہیں جب وقت آئے،
سب کوئی جائے،
سوئے بالا ہاں اور کس جا!
بولو چاچی،
سچی سچی،
جائے کس جا؟

۲۔ کہتے ہیں جانے سے پہلے
اک نیندا آئے
اور کب بج اٹھتا ہے گھنٹا۔
دروازے پے،
ماجھی آئے،
دوڑا دوڑا!

●

۳۔ آئیو میرے یوں ہی رہتے،
مرغا بانگے،
بستر پے سوتا تھا میں تو!
اور مکھن بھی،
ہاں ویسے ہی،
آدھی شب کو!

۴۔ لیکن تم سے میں یوں کہتا،
سب وقت اپنا،
کھیلوں میں تم سے کاٹوں گا!
گردن تھامے،
میں زوروں سے،
شب کاٹوں گا!

۵۔ وقت آئے پے نا مانوں گا!
نا جانوں گا،
ماجھی سے مارا گھنٹہ کب!
ہاں ماریگے،
راجہ اپنے،
کیا مجھکو تب؟

●

۶۔ سب کا کہنا جنت اچھی،
خوشبو جس کی،
ساری دنیا کو مہکائے!
ہردم جس جا،
شیریں چشمہ،
بہتا جائے!

۷۔ ہونے دو اچھی ہو جنت!
چھینے کوئی،
لیتا ہے کیا، بولو چاچی؟
جیسا بھی ہوں،
اچھا ہی ہوں،
سمجھیں چاچی!

●

۸۔ یہ ہے اپنا گولا باڑی!
گور روڈ گاڑی،
ڈالے پھوٹے پہیے جس کے!
شاخ گل پے،
دیکھ ناچے،
سایہ تھرکے!

۹۔ چپ سے چھپ کے پہنچوں اس جا!
موہن، ہیرا
دو بھائی اپنے ہمسائے!
ٹوٹی گاڑی،
جائے چلتی،
ہولے ہولے!

۱۰۔ شب کو چاچی کہنا قصے،
لیٹے لیٹے،
بجھ بجھ کر بتی جلتی جائے!
گھر کی چھت پے،
اُلو چیخے،
شب بڑھتی جائے!

■

۱۱۔ جنت کو تم مارو گولی،
ہاں جی چاچی،
دیکھوں کوئی کیا کرے گا!
چاچی کے گھر
روزِ محشر
تک ٹھہروں گا!

ملک کی عام فکری سطح

وزیر اعظم پنڈت نہرو نے دلی میں لالہ لاجپت رائے کی صد سالہ تقریبات منانے کی کمیٹی کے جلسے کی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ ہندوستان نے ایک بڑی لڑائی لڑی اور اس پر فتح پائی اور کچھ ذہین افراد بھی پیدا کئے۔ مگر اس کے باوجود ملک کی عام فکری سطح بہت ہی پست ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر لکیر کے فقیر ہیں۔ پرانے فقرے دُہراتے رہتے ہیں اور پرانے نظریات و تصورات کو سمجھے بغیر انھیں پر بہت سی باتوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کسی سماج کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کے ممبروں میں فکر کی صلاحیت نہ ہو۔

ملک میں قابل ذکر کتابیں نہیں لکھی جا رہی ہیں یہ زیادہ تر دوسرے اور تیسرے درجے کی ہیں۔ کسی بھی ملک میں شایع ہونے والی کتابیں کسی ایک ہفتہ کی لسٹ اگر آپ دیکھیے اور ان کا اسی دوران لکھی جانے والی ہندوستانی مطبوعات سے مقابلہ کیجیے تو آپ کو فرق معلوم ہو جائے گا۔ پروپیگنڈا بھی ہندوستان میں فکر انگیز نہیں ہوتا اس میں نمایشی پہلو زیادہ نمایاں ہے اسی وجہ سے یہ عوام کی فکر کو روشن نہیں کر سکتا۔

لالہ لاجپت رائے کی سوانح لکھے جانے کے بارے میں کمیٹی نے جو منصوبہ بنایا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جس قسم کی سوانح ہم لکھ رہے ہیں وہ انتہائی اکتا دینے والی اور مایوس کن ہے۔ ہندوستان میں لکھی جانے والی سوانح میں نہ تو حقیقت نگاری ہوتی ہے اور نہ ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا جا سکے۔ آپ ایک انسان کا تذکرہ اس طریقے سے کرتے ہیں جو بالکل غیر انسانی معلوم ہوتا ہے۔

ملک میں بڑے آدمیوں کے زیادہ تر ایسے مجسمے نصب ہیں جو دیکھنے میں اتنے زیادہ بدشکل ہیں کہ میں نے اس طرح قومی رہنماؤں کی یادگار بنانے کے خیال کی مخالفت کی۔ ان کھڑے ہوئے مجسموں کو دیکھئے یہ کتنے بھیانک ہیں۔ بیشتر ان میں اور جن کی یاد میں یہ نصب کئے گئے ہیں کوئی مشابہت نہیں ہوتی اور یہ انتہائی بدوضع و بدقطع ہوتے ہیں۔ قبل اس کے کہ کوئی مجسمہ نصب کیا جائے ماہر افراد پر مشتمل ایک کمیٹی سے اس مجسمے کو نصب کرنے کی اجازت لینی چاہیے۔

ہندی ترجموں کا کام پچھڑا ہوا ہے

ترجمہ اور طباعت کے منصوبوں کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ ہندی اور علاقائی زبانوں میں معیاری نصابی کتابوں کی تیاری کا کام اندرون میعاد پورا نہ ہو سکے گا۔

وزارت تعلیم کے ہندی ڈائرکٹریٹ نے سرکاری قوانین سے متعلق جو ۱۵۸۰۰ صفحات اور ۵۰۰۰ فارم گزشتہ مہینے کے آخر تک ترجمہ کئے ہیں وہ حسب ضرورت فارموں کی مقررہ تعداد کے مقابلے میں سمندر میں قطرے کی برابر ہیں۔ ہندی میں معیاری ادب کے ترجمے کا کام اب سے دس سال پہلے شروع ہوا تھا مگر اب تک سائنسی اور تکنیکی اصطلاحوں کی صرف ایک لغت اور متفرق نصابی کتابیں شایع ہو سکی ہیں۔

اس ضمن میں وزارت تعلیم کے نمائندے نے جو مولفوں اور مترجموں کی کمیابی کا عذر پیش کیا ہے اس کی تردید خود مولفوں اور مترجموں کی طرف سے ہو گئی ہے، مترجموں کے نمائندوں کو شکایت ہے کہ پبلشر ہندی ڈائرکٹریٹ سے ایک ہزار الفاظ پر چالیس روپے وصول کرتے ہیں۔ لیکن مترجموں کو صرف تین یا چار روپے فی ہزار اُجرت دیتے ہیں۔ ڈائرکٹریٹ یہ کام زیادہ تر پبلشروں کے ہی سپرد کر دیتا ہے۔

وزارت کو اب توقع ہے کہ طبعی سائنس، انسانیات، سماجی سائنس، جیومیٹری اور ادب سے متعلق مضامین کی تقریباً ۱۲۰ نصابی کتابیں ۱۹۷۵ء کے آخر تک تیار ہو جائیں گی۔

یہ کام پورے ملک میں پھیلی ہوئی یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور ماہروں کو تقسیم کر دیا گیا۔ ترجمے اور طباعت کے ادارے دہلی اور بنارس یونیورسٹی میں قائم کر دئے گئے ہیں اور دوسری یونیورسٹیوں میں بھی قائم کئے جا رہے ہیں پبلشروں کے تعاون سے عام پسند معیاری کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ بھی زیر غور ہے۔ اور یہ بھی تجویز ہے کہ ہندی میں جیبی سائز کی سستی کتابیں بھی ترجمہ کرائی جائیں، سفارت روس نے وزارت کو ہندی میں کتابیں شایع کرنے کے لئے پچیس عنوانات پیش کئے ہیں۔ اسی طرح امریکی سفارت بھی متعلقہ ہندی کتابوں کی تیاری کے پروگرام میں شرکت پر آمادہ ہو گئی ہے۔

(ہندوستان ٹائمز)

دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا بل

وزیر تعلیم ڈاکٹر کے ایل شریمالی نے جمعرات کے روز راجیہ سبھا میں دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا بل پیش کیا جس کی رو سے یہ ادارہ قومی اہمیت کا حامل تسلیم کیا جائے گا۔

اس بل کی رو سے اس ادارے کو ہندی میں قابلیت اور تعلیم کے سلسلے میں ڈگریاں، ڈپلوما اور سرٹیفکٹ دینے کا اختیار ہوگا۔ نیز مرکزی حکومت کو سبھا کے کاموں کی جانچ پڑتال اور اس سے پیدا شدہ نتائج کے پیش نظر مناسب ہدایات دینے کا حق ہوگا۔ یہ ادارہ مدراس میں ہے۔

(ٹائمز آف انڈیا)

سہ لسانی فارمولا اور شاخ انجمن لکھنؤ

انجمن ترقی اردو لکھنؤ کی مجلس عاملہ کا جلسہ زیر صدارت پنڈت آنند نرائن ملا منعقد ہوا حسب ذیل حضرات جلسے میں شریک ہوئے۔ پنڈت آنند نرائن ملا، پروفیسر مسعود حسن رضوی، سید علی عباس حسینی، محمد حسین خاں عرشی، وشوناتھ پرشاد سکسینہ، سید طاہر حسین نسیم گنجاہی، وحید الرحمٰن عرفانی، ڈاکٹر محمد یٰسین، سید فدا حسین، احمد یونس خالدی، سید امیر حسن نورانی، ڈاکٹر انوار الحسن، ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ہاشم میاں فرنگی محلی، ساحر لکھنوی، محمد جعفر مرزا، خواجہ محمد رائق، ڈاکٹر سید علی عباس زیدی، گیانی مہندر سنگھ، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (جنرل سکریٹری)

سابقہ کارروائی کی تصدیق کے بعد سہ لسانی فارمولے کے سلسلے میں گورنمنٹ کا جواب پڑھا گیا۔ جلسے نے متفقہ طور پر اس جواب کو اردو کے لئے غیر مفید قرار دیا اور حسب ذیل تجویز پاس کی:

"یہ جلسہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہے خصوصاً تیسرا پیراگراف نہایت مایوس کن ہے اور ہمارے مطالبہ کو کسی طرح پورا نہیں کرتا ہے۔ اور اردو پڑھنے والوں کو اسکول، عملہ اور حکام کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے جن کی غیر جانبداری کے اوپر اردو والوں کو مطلق اعتماد نہیں رہا۔ نیز یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کم سے کم سرکاری اسکولوں میں، اگر حکومت کی نیت اردو کا جائز مطالبہ رد کرنے کی نہیں ہے تو تعلیم کا کوئی مناسب انتظام کیوں نہیں کیا جاتا۔"

ایک تجویز کے ذریعہ سے ہر سال بیسک ریڈروں کی طباعت تاخیر ہونے پر جلسے نے اپنی تشویش اور بے اطمینانی کا اظہار کیا اور وزیر اعلیٰ سے مطالبہ کیا کہ وہ اردو ریڈریں وقت کے اندر چھپوائیں۔

جلسے نے سکریٹری کو ہدایت کی کہ وہ ریاستی انجمن ترقی اردو اتر پردیش کو کونسل کا جلسہ طلب کرنے کے لئے مقامی انجمن کی جلد تجاویز بھیجے اور جلد از جلد جلسہ طلب کرنے کے لئے لکھے۔

ایک اور تجویز میں یہ طے پایا کہ لکھنؤ میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو تعلیم کا جائزہ لے کر آئندہ جلسے میں پیش کیا جائے۔ (شجاعت علی سکریٹری)

تین بھاشائی فارمولا

دیش کے قریب قریب تمام صوبوں کے مکھیہ منتریوں نے ملک کی ایکتا خصوصاً اتر اور دکشن والوں کے دلوں سے یہ وہم ختم کرنے کیلئے کہ ہندی ان پر ٹھونسی جا رہی ہے تین بھاشائی فارمولا تسلیم کیا جس سے وہ یہ سمجھ سکیں کہ ہندی انہیں راشٹر بھاشا کے طور پر پڑھنی یا سیکھنی ہے، اور دوسری اتر والے دکشن کی ایک بھاشا پڑھیں۔ اس فارمولے کے تحت ہر بچے کو ہندی بطور راشٹر بھاشا، انگریزی بطور انتر راشٹر بھاشا اور ایک تیسری بھاشا مادری زبان یا کوئی اور علاقائی بھاشا پڑھنی ہوگی۔ مگر اس فارمولے کو مسلمانوں نے غلط طور پر سمجھتے ہوئے اس کا ورودھ کیا۔ اور مرحوم مولانا حفظ الرحمٰن نے جو اس وقت امریکہ میں زیر علاج تھے، فی الفور پنڈت نہرو کو لکھا کہ مجوزہ تیسری زبان کے بارے میں یو پی کے مکھیہ منتری کو لکھا جائے کہ دکشن کی بھاشاؤں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی رکھا جائے۔ چنانچہ اس چٹھی پر فوری عمل کے طور پر مکھیہ منتری یو پی شری چندر بھان گپتا کو لکھ دیا گیا اور ان کے لئے اس پر عمل کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ سال رواں سے چھٹی جماعت میں تین بھاشائی فارمولا لاگو کر دیا گیا ہے اور بچوں نے ہندی اور انگریزی لے لی ہے، اور تیسری بھاشا کے طور پر کوئی دکھنی زبان اپنانے کے بجائے اردو یا سنسکرت لی ہے۔ اور جن بچوں نے اختیاری مضمون کے لئے سنسکرت لی ہے۔ انہیں تیسری زبان کی شرط پوری کرنے کے لئے اردو ہی لینا پڑی ہے۔ اب مسلمان بچے تو اس سے خوش ہیں۔ مگر جو اردو نہیں پڑھنا چاہتے انہیں زبردستی پڑھنی پڑ رہی ہے۔ چاہئے یہ تھا کہ کسی دکھنی بھاشا کے پڑھائے جانے کا بندوبست کر دیا جاتا۔ مگر لسانی آڑ میں پھر سے فرقہ پرستی کو فروغ مل رہا ہے اور تین بھاشائی فارمولا کا بنیادی مقصد ہی ختم ہو رہا ہے۔ دوسری طرف ایسا کرنے سے بچوں کا قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے جنہیں ایک غیر ضروری اور غیر مفید بھاشا پڑھنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اتر والوں کو لازماً دکشن کی ایک بھاشا پڑھنی چاہیئے۔ اور اگر اردو کو رکھنا ہی ہے تو پھر یہ ایک فاضل اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جائے۔ (رمیش چندر ساہتیہ رتن بریلی) بحوالہ پرتاپ نئی دہلی۔

انجمن کی شاخ اُجین کی سرگرمیاں

انجمن ترقی اُردو شاخ اُجین کی جانب سے ایک میمورنڈم پرنسپل گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج اُجین کو پیش کرکے یہ مطالبہ کیا گیا کہ امسال دس بارہ طالبات نے ہائر سیکنڈری پاس کرکے آپ کے کالج میں بی۔اے سال اول میں داخلہ لیا ہے۔ وہ اُردو بطور اختیاری مضمون لینا چاہتی ہیں۔ جلد اس کی پڑھائی کا انتظام کیا جائے۔ پرنسپل صاحبہ نے میمورنڈم ڈائرکٹر کالجیٹ ایجوکیشن مدھیہ پردیش بھوپال کے پاس اپنی رائے کے ساتھ بھیج دیا۔ انجمن کا ڈیپوٹیشن ڈائرکٹر سے بھوپال جاکر ملا۔ انھوں نے غور کرنے کا وعدہ فرمایا۔ حکم ابھی تک نہیں آیا ہے۔ نائب وزیر تعلیم محترمہ سہائے صاحبہ دورہ پر اُجین آئیں تو ان سے بھی وفد ملا۔ انھوں نے بھوپال جاکر حکم بھیجنے کا وعدہ کیا۔ حکم نہ آنے سے ریمائنڈر بھیجے جا رہے ہیں۔ طالبات کو دقت پیش آرہی ہے

مادھو پوسٹ گریجویٹ کالج اُجین جو وکرم یونی ورسٹی کالج بن گیا ہے اُس میں ایم۔اے اُردو کلاسیز کی ابتدا کرنے کے لیے عرصے سے کوشش ہو رہی ہے۔ مادھو کالج میں سنسکرت، مراٹھی اور دیگر مضامین میں ایم۔اے کلاسیز شروع ہو چکی ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُردو نہ پڑھائی جائے۔ کافی طلبہ ایم۔اے اُردو میں کرنا چاہتے ہیں۔ وکرم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر رام پرشاد ماتھر صاحب نے وعدہ فرمایا تھا اور اسی سلسلے میں اشتہارات نکلے تھے اور ڈاکٹر قمر رئیس انٹرویو میں بلائے گئے تھے مگر سینیٹ کے ممبروں کے آپس میں جھگڑے کی بنا پر دوسرے مضامین کے پروفیسر کے ساتھ ساتھ قمر رئیس صاحب کا تقرر نہ ہو سکا۔ نئے وائس چانسلر ڈاکٹر دتہ صاحب کو میمورنڈم پیش کیا گیا جس پر انھوں نے غور کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

مادھو کالج اُجین میں (Working men classes) ورکنگ مین کلاسیز (صبح) دس بارہ طلبہ اُردو پڑھنا چاہتے ہیں۔ بی۔اے ریگولر میں اُردو پڑھانے کے لئے پروفیسر سکسینہ مقرر ہیں۔ جنرل سکریٹری شاخ سلطان احمد صدیقی ایم۔اے ایل ایل بی (علیگ)، ڈاکٹر شیو منگل سنگھ سمن پرنسپل سے ملے اور یہ مطالبہ کیا کہ ورکنگ مین کلاسیز میں اُردو پڑھانے کا انتظام کیا جائے۔ پرنسپل نے سکسینہ صاحب سے رائے مانگی انھوں نے تحریر فرمایا میں ہفتے میں اٹھارہ پیریڈ پڑھاتا ہوں۔ صبح کلاس نہیں لے سکتا۔ نئے اسٹاف کا تقرر کیا جائے۔ پرنسپل سمن صاحب نے بجٹ منظوری اور خرچ کی بنا پر مجبوری ظاہر کی۔ سلطان احمد صدیقی نے انجمن کے مشورے پر اعزازی طور سے بلا شرط اُردو پڑھانے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دی ہیں۔ پرنسپل صاحب نے تحریری درخواست نقل اسناد لے کر بعد منظوری وائس چانسلر مطلع کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

انجمن کی کوششوں سے امسال جامعہ اُردو علی گڑھ کے امتحانات ابتدائی۔ ادیب۔ ادیب ماہر۔ ادیب کامل میں اٹھارہ طلبا و طالبات نے فارم بھرے ہیں۔ انجمن کی لائبریری سے کتابیں جاری کرکے مفت کوچنگ کی جا رہی ہے۔

جشن آزادی پر بزم اہل ادب کا شاندار مشاعرہ ہوا۔ جس میں اراکین انجمن شریک ہوئے۔ ۲۲ر اگست سے ۳۰ر ستمبر تک گنیش اُتسو منایا جا رہا ہے۔ جیوتی نگر کالونی مہیل ہائی ڈل ورکس میں انجمن کے اہتمام میں مشاعرہ ہوا۔ پچیس مقامی شعرا شریک ہوئے۔ رات میں ۹ بجے سے ۲ بجے تک کامیابی سے چلا۔ سامعین ذوق و شوق سے آخر وقت تک جمے رہے۔ اُردو کی نشر و اشاعت اور مقبولیت میں مشاعروں کا بڑا ہاتھ ہے۔ (سلطان احمد صدیقی جنرل سکریٹری)

سٹرک ارجنی میں انجمن کی شاخ کا قیام

حامیانِ اُردو سٹرک ارجنی تحصیل ساکولی ضلع بھنڈارہ مہاراشٹر نے فیض انصاری سکریٹری انجمن ترقی اُردو (دور بھدر بجن) کی آمد سے فائدہ اٹھا کر یہاں انجمن مذکورہ کی ایک شاخ تشکیل دی اسی جلسے میں حامیانِ اُردو نے طے کیا کہ سٹرک ارجنی میں اُردو کا پرائمری اسکول جاری کیا جائے۔ یاد رہے کہ ۱۹۴۳ء تک یہاں اُردو پرائمری اسکول حکومت چلاتی تھی لیکن ضلع پریشد کے زمانے میں باوجود کوششوں کے اسے دوبارہ جاری نہیں کیا گیا۔ اب طے کیا گیا ہے کہ انجمن کی شاخ کے زیر اہتمام ایک پرائمری اُردو اسکول فوراً جاری کیا جائے۔ ارجنی میں اس وقت اُردو پڑھنے والوں کی تعداد کم و بیش سو ہے۔

انجمن کے عہدے دار حسب ذیل ہیں:

صدر: جناب عمر بھائی محمد بھائی۔ نائب صدر: جناب محمد حسین۔ سکریٹری: عبدالستار صاحب قریشی۔ نائب سکریٹری: عبدالستار عبدالغنی۔ خزانچی: افتخار علی حامد علی۔ ممبران: (۱) سید طاہر علی مردان علی۔ (۲) عبدالصمد قریشی۔ (۳) عبدالمجید عبدالعزیز سوداگر۔ (۴) عبدالرشید عبدالعزیز۔ (۵) محمد عباس (۶) محمد خاں۔

(عبدالستار قریشی سکریٹری)

اُردو کالج ناگرکول کے نتائج

محبوب نگر کا ہفتہ وار اخبار تعمیر راوی ہے کہ اُردو کالج ناگرکول کے نتائج اس سال ۹۰ فی صد رہے۔

کیدار شرما کا دیہانت

ہندی کے ادیب کیدار شرما جی پر بنارس میں فالج کا حملہ ہوا تھا۔ وہ اس مرض سے جانبر نہ ہو سکے، اور ۶۷ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

سلطان احمد سابق مدیر اتحاد پٹنہ

مطالعہ

وہ رحمٰن ہے، جس نے قرآن سکھایا۔ انسان کو پیدا کیا اور بیان عطا فرمایا۔

سچائی کلام کی جان ہے، اور سادگی زینتِ سخن۔ پُرکاری ادب کی صورت گری ٹھہری، اور کتاب مرقعِ خیال۔ الفاظ ضرورتوں سے ڈھلتے ہیں۔ ٹکسالی ضرب ہیں کھا کر زبانوں پر چڑھتے ہیں۔ نرم و نازک لبوں سے ادا ہوتے ہیں۔ پھر قدر و قیمت کو پہنچتے ہیں اور اپنے اثر و رسوخ کی بدولت، منقول ہو جاتے ہیں۔ تقریر، سننے والوں کو متاثر کرتی ہے، اور تحریر، قلم کی زبان اور سخن کی رازداں ہے۔ یہ نزدیک و دور ہر جگہ اپنے علم و کلام سے فائدہ پہنچاتی ہے۔ ظاہر بیں اس کا پیکر سیاہ دیکھتے ہیں، اور حقیقت شناس اس کو چراغِ ہدایت سمجھتے ہیں۔ احوال سے باخبر ہونا اور خاطرِ پریشاں کو جمع رکھنا، بقائے صلح کی علامت اور زندگی جاوداں کا نشان ہے کہ شاید کسی طرف سے کوئی دل آویز سخن سنائی دے یا کوئی عملِ حسنہ الیسا دکھائی دے۔ جس سے علم و دانش کی ایک جدید شعاع دل میں روشن ہو۔ کسی کتاب کی حقیقت اسی وقت کھلتی ہے جب اس کے پڑھنے اور سمجھنے کا حق ادا کیا جائے۔ عرفِ عام میں اسی عمل کو مطالعہ کہتے ہیں۔ یہ بطورِ خود ایک دل چسپ مشغلہ ہے۔ سُبک تر اور گراں قدر بھی مطالعہ تفریح کا ذریعہ اور تخلیق کا وسیلہ ہے۔ وقتی لحاظ سے دونوں مفید و کارآمد، کہ ہر وقت کے لئے ایک کام اور ہر کام کے لئے ایک وقت ضروری ہے۔ کوئی کام بغیر توجہ اور دل چسپی کے پورا نہیں ہوتا۔ اس سلسلے کو قائم رکھنے کے لئے تبدیلی ایک ایسی تفریح ہے جو توازن کو بگڑنے نہیں دیتی اور معیار کو پست ہونے سے روکتی ہے۔ گو صلاحیتیں مختلف ہوں، پھر بھی تبدیلی اتنی خوش آیند ہے کہ ہر شخص تازہ دم اور تیز گام ہو جاتا ہے۔ تفریح کا مطالعہ جس قدر آسان ہے اسی قدر اس کی شگفتگی عارضی ہے۔ اس کے برعکس سبق و تحقیق کا مطالعہ محنت طلب اور جان توڑ ہوتا ہے۔ لیکن اس کی فتوحات سے ہمارے دماغ روشن اور دل آئینہ بن جاتے ہیں۔

اب نظر و خبر کا وہ کون سا وقوعہ ہے جو ہماری گرفت سے نکل جائے اور کسی فکر و ذکر کا محرک نہ ہو۔ مطالعے کی صورت مشاہدہ ہے، اور نظر اس کی علامت۔ جس سے کسی ہیئت کا نشان ملے اور منزل کا پتہ چلے۔ نظر مطالعہ سے ملی اور خیال کی رفتار آگے بڑھی۔ دیکھو وہ آفتاب روشن ہوا جس نے دنیا کی عظمتوں کو اپنی کرنوں سے منور کیا۔ ماہتاب کی وہ شعاعیں ضیا پاش ہوئیں، جن سے محبت کے چراغ جلے۔ رات کی وہ تاریکیاں، بطنِ گیتی میں آسودہ ہیں۔ جن میں مہیب سے مہیب ذلیل اور گھناؤنی حرکتیں سرزد ہوئیں۔ سامنے لق و دق میدان ہے، دنیا کے عالی شان ایوان و محل کھڑے ہیں۔ جن میں رزم کی ہلاکت خیزیاں اور بزم کی دل نوازیاں جلوہ گر ہیں۔ غرض طلوع و ظہور کی ساری کیفیتیں مطالعہ میں چھپی ہیں۔ گویا ذہنِ انسانی میں کائنات کی پوری تصویر آویزاں ہے۔ جیسے بیج کے ایک ننھے میں سنا ور درخت، اس کے حسین پھول، رسیلے پھل اور برگ و بار سبھی پوشیدہ ہوں۔ اگر تصور چاہے تو جنت کی فضائیں اور جہنم کی ہولناکیاں ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں۔ مطالعہ تصور کو متحرک کرتا اور دیدہ ور بناتا ہے۔ یہ خیال پیدا کرتا ہے اور خیال منظر۔ ایک دعوت دیتا ہے، دوسرا ارشاد کا کام کرتا ہے۔ اس تخلیقی ماحول کے علاوہ، عام مطالعے کی صورتیں بھی ہیں، جو اپنی اپنی طلب اور صلاحیتوں پر منحصر ہیں۔ کسی کے نزدیک اوراق کا الٹنا اور وقت کا گزار دینا ہی مطالعہ ہے جہاں کتاب ملی اور دل بہلانے کی ایک صورت نکلی۔ جیسے بچے کو کھلونا ملے اور خوش ہو جائے۔ کتنے ایسے بھی ہیں جن کے لئے مطالعہ صرف خواب آور ہے۔ کتاب کھلی اور آنکھیں بند۔ حالانکہ مطالعے کی ابتدا خبر اور انتہا فکر ہے اور جب دماغ حاضر اور دل متوجہ ہو تو مطالعے کی صورتیں پائیدار ہوتی ہیں۔

مطالعہ ایک جامع اور وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ بچوں کی حرف شناسی اور "الف دو زبر آن" بھی مطالعہ ہے اور کسی عارفِ کامل کا بلا طلوع، نظارۂ جمالِ آفتاب مطالعے کے سوا کیا ہے؟ طلوع اگر مطالعہ ہے تو بلا طلوع مشاہدۂ فکر کی دلیل۔ جب کسی کا سامنے ہونا اور اس کا دیکھنا نظر کا مطالعہ ٹھہرا تو فکر کا رتبہ بلند یہ ہے کہ نادیدہ کو دیدہ بنائے۔ اور تصور، تصویر بن جائے۔ لیکن یہ ایک انتہائی مشق و کمال کی صورت ہے۔ ایک کارآمد مطالعے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ کتابی مفہوم سمجھ میں آجائے۔ یہی مطالعہ ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ محض گزرانِ وقت مطالعہ ہے یا نہیں؟ کہتے ہیں، وہ مطالعہ بہت کامیاب ہے جو وقت کے ضروری ہونے کا احساس دلائے اور کسی مفید کام میں لگائے۔ صرف وقت کے گزار دینے کی خاطر مطالعہ، اگرچہ بہت پست درجے کی مشغولیت ہے۔ لیکن جنھیں اس سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہو۔ ان کے لئے مطالعے کی یہ صورت بھی غنیمت ہے، کہ وہ منافات سے بچ کر اپنا وقت اس طرح گزار لیں۔ خواہ اپنے لئے زیادہ مفید نہ ہوں۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ دوسروں کے لئے نقصان رساں نہ ہوئے۔ بڑی خرابی، جس سے ہمیشہ بچنے کی ضرورت ہے، وہ بیکاری ہے یا ایذا رسانی، اور افسردگی آگے بڑھی اور مایوسی ہوئی۔ یہ سب سے زیادہ خوف ناک اور

مُہلک ہے۔ مانا کہ وقت گزار مطالعہ بیداری کا خواب ہے۔ لیکن یہ اندیشے دور کرتا اور جذبات کو قابو میں رکھتا ہے۔ انسان جس حال میں ہو مطالعہ اس کی تسکین کرتا ہے، اصلاح کا موقع دیتا ہے اور بہتیری غلطیوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ یہ جنگلوں اور پہاڑوں کی سیر کراتا ہے۔ ملکوں اور قوموں سے ملاتا ہے۔ کیسے کیسے اجنبی و ناآشنا اس کی بدولت یار و آشنا بن گئے۔ ممالک غیر سے قریب تر ہونے کا یہ ایک ایسا رابطہ ہے جو ہماری رسائیوں سے پہلے ہی رشتۂ خیال کو منسلک کرتا ہے۔ پھر تعلقات بڑھاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی ہمدردی و ہمنوائی کرنے لگتے ہیں۔ اور بالآخر دوست و رفیق بن جاتے ہیں۔ جس طرح جسم کے اعضا باہمی معاون و مشترک ہیں اسی طرح یہ نظام فکر بھی جذب و کشش کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ جہاں مطالعے کے کسی نکتے پر نظر پہنچی اور کسب فیض کی راہیں کھلنے لگیں۔ یہی نہیں کہ وقتی افکار معاونت کرتے ہیں۔ بلکہ قدیم اور گزرے ہوئے حالات بھی اپنی سرگزشتوں کو اس طرح دہراتے ہیں کہ علم و بصیرت کا ایک ایک پہلو روشن اور تاباں ہو جاتا ہے۔ مطالعہ رواں، دماغ جاذب اور بساطِ خیال اتنی دراز و کشادہ کہ واقعات کی دھڑکنیں جو کتابوں میں قلم بند ہیں۔ قابو میں آنے لگتی ہیں۔ ان کا عمل کتنا ہی خاموش ہو لیکن تاثرات کی یلغاریں جاری ہوتی ہیں۔ اور مطالعہ ایک ایسی منزل پہ پہنچ جاتا ہے جہاں فکر کی رسائیاں زمان و مکان کو عبور کرتی ہیں!

یہ اب کوئی راز کی بات نہیں کہ حرکت کی ہر آواز اس کون و فساد میں امتدادِ زمانہ کے باوجود محفوظ ہے مگر انسان کے مر جانے کے بعد ہم اس کی دوبارہ زندگی پر متعجب ہوں، اور انکار کریں۔ جب کہ ہوا میں منتشر ہو جانے والی آواز نازک و لطیف اور بلا شکل و صورت ہمارے قبضے و تصرف میں ہو۔ اور ہم جب چاہیں، مدتوں کے مرے ہوؤں کی جانی پہچانی آوازیں سُن سکتے ہیں۔ پھر کیا یہ محال ہے کہ شکنتلا کے نازک لبوں کے میٹھے بول، ہلاکو و چنگیز کے قہرمان اور خون آشام الفاظ اور پورس و سکندر کے خسروانہ ارشاد، ان کے حقیقی لب و لہجے کے ساتھ ہماری گرفت میں نہ آئیں؟ اگر وہ ہماری سماعت میں نہ آئیں تو قصور ہماری کشش کا ہے نہ کہ قدرت کی ہمہ گیریوں کے کسی نقص کا۔ جب کہ مطالعے کا سیلِ رواں جذب و کشش موجزن اور دل کی تڑپ پکار پکار کر یہ کہہ رہی ہو کہ سمجھو اور غور کرو، کائنات کی اس ترتیب و تنظیم کو دیکھو کہ وہ کس حسن و دلربائی کے ساتھ تمہارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ یہ سورج چاند اور تارے سب تمہارے لئے مسخر و معاون اور تمہاری خاطر کتنی عظیم الشان اور جلیل القدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

تم ان سے بے شمار فائدے اُٹھاؤ، کبھی یہ بھی سوچتے ہو کہ انہیں تم سے کیا فائدہ پہنچا؟ وہ حکم کے بندے ہیں، اپنے فرائض سے نہیں چُوکتے۔ اور تم ہر سانس کی تنبیہ پر اور غافل ہو۔ جیسے تمہیں اپنی بندگی کا احساس ہی نہ ہو۔ اگر یہ کائنات تمہارے لئے سرگرم عمل ہے تو کیا یہ تمہارا فرض نہیں کہ قدرت کے اس دستور کو اپناؤ اور اپنے علاوہ دوسروں کے لئے بھی مُفید ہو۔ ہم سانس لیتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں۔ لیکن اس گراں قدر اور لطیف ترین ہوا کو ہم سے کیا ملا؟ اس طرح دوسرے عناصر اور عوامل جو اس زندگی کے ظہور و ترتیب کے اسباب و علل ہیں۔ ذرا دم بھر کے لئے سوچو، بھلا ان کو ان خدماتِ جاریہ سے کیا حاصل؟ مانا کہ سب ہمارے ہی لئے ہوں، مگر ہم اپنے خالق و مالک کے لئے نہ ہوں۔ تو اس سے زیادہ طغیان و سرکشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ زمانے کی یہ سازگاریاں اور یہ ساری ترقیاں اسی غور و فکر کا نتیجہ ہیں جو مطالعے سے حاصل ہوتی ہیں۔ وقت کی مہلتوں اور گنجائش کی وسعتوں میں اس کی ایک آن اور کوئی شے دیکھی کب اور کہاں ضائع ہوئی۔ البتہ حرکت کی بدولت یہ سارا انتظام ہر لحظہ بدل رہا ہے اور تغیر اپنا کام کر رہا ہے۔ ورنہ ایک ذرہ بھی ان کی گرفت سے باہر نہیں۔ صورتوں کی تبدیلی سے کسی شکل کا قائم نہ رہنا، اس کی اصلیت کے باقی نہ ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ یہ تبدیلی ہی کسی حکم کا جواز رکھتی ہے۔ اور جب ایک باضابطہ اور مقررہ نظم کے ماتحت حکمرانی کا سلسلہ مان لینا پڑا تو پھر ایک حاکم مطلق کے تسلیم کر لینے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ جس کے سب مطیع و فرماں بردار ہوں۔ خصوصاً جبکہ سچائیوں کے بہترین ذریعوں سے ہمیں بار بار متنبہ کیا گیا ہو کہ ہم اس کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ تو پھر ہماری برگشتگی کا یہ عالم کس درجہ المناک ہے!

غرض یہی مطالعہ ہے اور یہی مطالعے کا مقصد — کوئی حرف ہو یا حکایت، بس دیکھیے، یا سُننے کی تکرار و تجدید۔ جو نئی لذت پیدا کرے یا پرانی لذتوں کو دہرائے۔ کیونکہ انسان کی فطرت نہیں بدلی۔ البتہ ادا کار بدلتے رہے۔ اور موقع و محل کا فرق ہو۔ لیکن تاثرات یکساں ہی قائم رہے۔ اور مطالعے کے کمال و معراج میں کوئی خلل نہیں۔ لیکن اپنی رسائی کی ناکامیوں سے حقیقتوں کا انکار، نہ تو ہمت کے شایاں ہے اور نہ عقل کے موافق۔

وحید اختر

تبصرہ

تین کتابیں

مکتبۂ آسی کراچی نے تین شاعروں کے مجموعوں کو یک جا کتابی صورت میں اس نام سے شائع کیا ہے۔ مغربی زبانوں میں تو یہ طریقہ عام ہے لیکن اردو میں پہلی بار اس طرح کی کتاب شائع ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں عام طور پر "بہترین ادب" کے نام سے انتخاب شائع کرنے کی بدعت عام ہے۔ اس طرح کے یک طرفہ انتخابی مجموعوں سے نہ تو شاعروں کے متعلق کوئی علم ہوتا ہے نہ ان کی تخلیقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ پھر ہر انتخاب کرنے والا اپنی ذاتی پسند کی بنیاد پر جن چیزوں کو "بہترین ادب" کے خطاب سے نوازتا ہے، وہ خود ادب کے ساتھ بھی کم ہی انصاف کرتی ہیں۔ اس طریقے سے بہتر یہی طریقہ ہے کہ بغیر کسی قسم کے القاب خطابات کے نئی نسل کے شاعروں کے انتخاب کلام کو ایک ساتھ شائع کیا جائے، اس سے خود شاعروں کی بھی پوری نمایندگی ہوتی ہے اور جدید رجحانات کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن اس طرح کے مشترکہ مجموعوں کے لئے کوئی بنیاد اشتراک بھی ہونی چاہئے، ایسے شعرا جو کسی خاص رجحان یا مکتب خیال کی نمایندگی کرتے ہیں، ایک ساتھ پیش کئے جائیں تو اس رجحان کی تفہیم و تنقید آسان اور مفید ہوگی۔

زیر نظر مجموعہ میں تین شاعروں کی تخلیقات شامل ہیں، محبوب خزاں، محب عارفی اور قمر جمیل۔ ان تینوں کے مطالعے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے مواد اور اسلوب کے لحاظ سے ان میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ بجز اس کے کہ تینوں نئی شاعری کی نمایندگی کرتے ہیں، پچھلے دس برسوں سے جس طرح کی شاعری کی جا رہی ہے اور جسے "جدیدیت" کا نام دیا جاتا ہے کسی جہت، مقصد اور خیال سے عاری ہے، بنیادی طور پر جدیدیت کا یہ تصور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پیدا ہونے والے ادب کی اس روش کا رد عمل ہے جس میں محض مقصدیت ہی کو ادب کی اوّل و آخر شرط سمجھ لیا گیا تھا، بذات خود یہ رد عمل ایک صالح سمت کی نشاندہی کرتا ہے، لیکن یہ دیکھا جا رہا ہے کہ خود اس رد عمل نے دوسری انتہا کو اختیار کر کے ادب میں بے مقصدیت اور بے جہتی کی وبا عام کر دی ہے، شاعری کا موضوع غم ذات ہو یا غم جاناں، غم دوراں ہو یا غم کائنات، ان کا شعری اظہار اگر ابلاغ کی بنیادی شرط ہی کو پورا نہ کرے تو شاعری چیستاں بن جاتی ہے، اور اگر چیستاں نگاری ہی فن ٹھہرے تو پھر خیال، جذبہ، احساس اور تاثر بے ہنگی ہوئی خوشبو بن جاتے ہیں، اور الفاظ کاغذی پیرہن پہن کر فریادی نظر آتے ہیں، ہندوستان کے ساتھ ہندوستان کی تہذیبی میراث اور بطور خاص اردو ادب کو تقسیم کرنے والی سرحد کے دونوں طرف اس رجحان نے شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ اور تنقید میں بھی مقبولیت حاصل کر لی ہے، اس طرح کا ادب ایک طرف تو کسی سماجی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا دوسری طرف ادب اور فن کی شرائط سے بھی گریزاں ہو جاتا ہے، اگرچہ ہمارے پڑوسی ملک میں "پاکستانی ادب اور اس کے اپنے مخصوص مسائل" پر بہت زیادہ زور دیا جانے لگا ہے اور بعض حضرات نے تو ہندوستان کے ادیبوں اور ان کی ادبی تخلیقات کو یکسر اپنے ادب سے خارج البلد کر دیا ہے مگر ہندوستان میں اردو کے ادبی رسائل کی کمی اور نشر و اشاعت کے وسائل کی کوتاہ دامنی کے باعث ہمارے ادیب، اور خاص طور پر نئے شاعر و افسانہ نگار پاکستانی رسائل کی طرف ہی دیکھتے ہیں اور وہاں کے اثرات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہر نیا رجحان ہمارے ملک میں بھی اسی طرح لکھا جاتا ہے "تین کتابیں" جدید شاعری کے مختلف رجحانات کا آئینہ ہونے کے باعث ہمارے لئے بھی اہم ہے۔

محبوب خزاں، محب عارفی اور قمر جمیل کی شاعری کی نشو و نما بڑی حد تک اسی ماحول میں ہوئی ہے، اسی لئے میں نے اس عام رجحان کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھا ہے، تینوں پاکستان کی جدید شاعری کی نمائندگی کرتے ہیں، اگرچہ محب عارفی اپنے انداز بیان کے لحاظ سے اس قدیم مکتب شعر کے آدمی معلوم ہوتے ہیں جو ڈکشن اور موضوعات میں اقبال کی تقلید سے چھٹکارا انہیں پا چکا ہے، مگر ان کی بعض غزلوں اور ایک دو نظموں میں جدید طرز کو اپنانے کی کوشش ضرور نظر آتی ہے۔ اپنی اپنی جگہ تینوں شاعر جدیدیت کے موجودہ میلان سے متاثر بھی ہیں، اور اس طرح اپنی انفرادیت بنانے میں کوشاں بھی۔

"تین کتابیں" کی پہلی کتاب "اکیلی بستیاں" ہے اور اکیلی بستیوں کے شاعر ہیں محبوب خزاں، جن کی اکثر نظمیں بڑی حد تک جدید شاعری کی اس "جدیدیت" کی نمایندگی کرتی ہیں جس پر خود اپنے اسرار منکشف نہیں ہوئے،

یونہی سا اک خیال ہے
تمہارے پاس جسم ہے جمال ہے
تمہاری زلف ریشمیں بڑا حسیں خیال ہے
مگر مری نظر میں ہے وہی جمال بے نشاں
وہی سوال جاوداں

مگر یہ "سوال" کیا ہے اس کا جواب نہ شاعر کے پاس ہے نہ تبصرہ نگار کے — اور اس کا سبب یہ ہے کہ ——

نہ اندھیرے نہ اجالے سے عداوت ہے مجھے
رات ہے دن ہے مگر مجھ کو تو دونوں سے ہے کام

لیکن اس مدوجزر کو بھی کہیں نہ کہیں ایک مرکز تو مل جاتا ہے ——

سوچنے کے لئے شاید یہ سر و ساماں نہیں
اے مرے دیدۂ بے خواب جگت سے نہ بھاگ

کیا محبت کا یہ تصور بھی جذبے کو شدت، احساس کو گہرائی اور خیال کو گیرائی دے سکتا ہے؟ اس کا جواب ان نظموں سے مل سکتا ہے جن کا موضوع رومانی ہے مگر جو اپنی جگہ تشنہ معلوم ہوتی ہیں؛ اور یہ احساس ہوتا ہے کہ یا تو جو بات کہی جا رہی تھی، وہ درمیان سے ٹوٹ گئی یا پھر الفاظ کی بوتلوں میں ڈھل ہی نہیں سکی۔ غزلوں میں اس تشنہ اظہار نے جابجا اچھے اور دل کو لگنے والے اشعار بھی کہلوا لئے ہیں جو نگاہِ انتخاب پر پورے اُترتے ہیں۔

ایک اور بات، تنہائی کا وہ اٹل احساس، جو ہمارے معاشرے میں ہر حساس ذہن کے لئے مرض بن گیا ہے، ان اشعار میں دبائے نہیں دبتا اور بعض جگہ تو بہت واضح ہو گیا ہے ؎

ہاں اس نے کہا تھا کہ سدا جلتے رہو گے
مجھ سے نہ کہو گے تو زمانے سے کہو گے
تب میں نے کہا، دونوں اٹل، دونوں اکیلے
بجھو گے تو بجھو گے، سہو گے تو سہو گے

اور تنہائی کا یہ احساس اپنے مداوا کے لئے زیادہ دور بھی نہیں جاتا ؎

اپنی تلاش کون کرے، دور کون جائے
اہلِ سخن ہیں، اہلِ سخن کی تلاش میں

اسی تلاش کے عمل میں وہ اپنی انفرادیت کے امکانات ڈھونڈ رہے ہیں جو ان کی آواز کو دوسروں سے منفرد کر سکتی ہے۔

محب عارفی، اس تثلیث کے دوسرے رکن ہیں، ان کی شاعری "گلِ آگہی" کے نام سے اس کتاب میں شریک ہے، اکثر نظمیں اقبال کے طرز میں لکھی گئی ہیں، مثلاً رہائی، جنت فردا، فلسفۂ کربلا، تشیل نے، آگہی اور جراثیم کی مناجات طویل نظمیں ہیں۔ آخر الذکر نظم میں دنیا کے اپنے قدموں سے تباہی کی اس منزل تک جانے کا خاکہ ہے کہ جہاں ؎

کرے اُٹھ کے باصد ہزار احترام　　ہر اک شہر کو ہیروشیما سلام

محب عارفی کو اپنی بات کہنے کا انداز آتا ہے، اگرچہ سانچے پرانے ہیں کچھ نظمیں آج کی مختصر نظموں کے رنگ میں لکھی گئی ہیں اور ابتدائی نظمیں موجودہ عہد کے انتشار، بے یقینی اور تنہائی کے احساس کی حامل ہیں۔ غزلوں میں اچھے اشعار مل جاتے ہیں، مگر اس قسم کی غزلیں ؎

کسی نے سبق تکوین کا آخر لکھا کیوں ہے
کہ جس کی ابتدا کیا، متن کیوں کر، انتہا کیوں ہے

آج کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں اور نگاہِ انتخاب میں کھٹکتی ہیں،

اس مجموعے کی تیسری کتاب قمر جمیل کی "خواب نما" ہے۔ قمر جمیل اس گروہ کے شاعروں میں سے ہیں جن میں جعفر طاہر کا نام سر فہرست نظر آتا ہے، داستانوں اور تاریخی روایات سے حال کے لئے علامتیں اور مواد فراہم کرنا ایسا رجحان ہے جو پاکستان کی جدید شاعری کا ایک ابھارا رجحان ہے، یہ رجحان اپنا رشتہ ایک طرف تو موہنجوداڑو اور گوتم بدھ سے جوڑتا ہے، دوسری طرف اسلامی روایات؛ اور اسلامی ممالک کی جدید تحریکوں سے اپنا سلسلہ ملاتا ہے۔ قمر جمیل کی بیشتر نظمیں مشرقِ وسطیٰ کے مسائل و موضوعات پر لکھی گئی ہیں، اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاید وہ اپنے ملک کو بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔ ان نظموں میں "دجلہ کے خواب" ایسی نظمیں بھی ہیں جن میں الف لیلوی رومانی فضا پیش کی گئی ہے اور "نیل کا سیلاب" ایسی نظمیں بھی جو ایشیا کی تحریک آزادی کی روح سے ہم آہنگ ہیں، یہ نظمیں ایک واضح مقصد اور جدید سیاسی شعور کی ترجمان بھی ہیں، اور ساتھ ہی نعرہ بھی نہیں بنیں، کیونکہ علامتوں اور استعاروں کی زبان نے ان کی شعریت کو مجروح ہونے سے بچا لیا ہے، بجائے اس کے کہ ہم مغرب کی اس مشینی تہذیب سے اپنے لئے علامتیں لیں، جس کے اثرات اب تک تو آزاد ملکوں کے سماج میں سرایت نہیں کر سکے ہیں، یا مغربی اساطیر اور تاریخ کی شخصیتوں اور واقعات کو علامتوں اور استعاروں کی بنیاد بنائیں یہ کوشش زیادہ مستحسن بھی ہے اور کامیاب بھی کہ ہم اپنے ہی ماضی اور اپنے ہی حال سے نئی علامتیں ڈھونڈ نکالیں اس طرح ہم اپنے ادب کے مزاج سے بھی انصاف کر سکتے ہیں اور الفاظ کو نئے معانی سے توسیع بھی دے سکتے ہیں۔

قمر جمیل کے مجموعے میں دوسرے رنگ کی رومانی اور ذاتی نظمیں بھی ہیں، اور غزلیں بھی مگر اُن کا یہی رجحان سب سے اہم قابلِ ذکر اور قابلِ قدر ہے۔

غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ نئے موضوعات کا خوش گوار امتزاج ملتا ہے۔ اس مجموعے میں قمر جمیل کی شاعری ہی دل کو اپنی طرف سب سے زیادہ کھینچتی ہے۔

تین کتابیں اپنی ضخامت، کتابت، کاغذ اور گیٹ اپ کے لحاظ سے دو روپے پچاس پیسے میں ارزاں ہے، اور اس لئے قابلِ مطالعہ ہے کہ جدید شاعری کے بعض رجحانات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن علی گڑھ سے شائع کیا